Vol.5 No. 2 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

وجہِ بیگانگی نہیں معلوم

(اردو اور ہندی: لسانیاتی تناظر، اہم مباحث اور جدید تقاضے)

*داؤد حسین

پی ایچ۔ڈی اردو (اسکالر)، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

Urdu-Hindi Controversy has been a subject of linguistic interest due to its typical yet unique nature. It's not merely a case of diagraphia but indicates a number of underlying reasons which lead to the standardization of Urdu language by setting it on two separate paths. This article explores the basic and important issues which have been the cause of this controversy. The historical, religious, socio-political and linguistic aspects of this controversy have been discussed to understand the problems that lead to an ever widening gap between the two speech communities which shared a common culture for centuries.

Key words: Urdu-Hindi, Standardization, Collonialialism, Writing System, Biscriptality/ Digraphia

کلیدی الفاظ: اردو-ہندی، معیّاربندی، نوآبادیات، رسم الخط، ذوخطی

ہندی۔اُردو تنازع:

زبان انسان کے تہذیبی اور علمی ارتقا کا ایک نہایت اہم پہلو ہے۔ تصویروں، آوازوں اور حرکات و سکنات کی مدد سے ابلاغ کی اوّلین صورتوں سے لے کر باقاعدہ الفاظ، بولیوں، زبانوں اور ان میں اعلیٰ ادب کی تخلیق تک کا سفر صرف اظہار کے وسائل کے ارتقا کی داستان نہیں ہے بلکہ در حقیقت یہ انفرادی طور پر انسان اور مجموعی طور پر قومی و علاقائی سطحوں پر انسانوں کے گروہوں کے علمی، فکری، تہذیبی، لسانی، مذہبی، سیاسی و معاشرتی اقدار اور روّیوں کی تشکیل اور ان میں آنے والی تبدیلیوں کی بھی ایک نہایت دلچسپ کہانی ہے۔

زبان کا مطالعہ، دیگر علوم کے ساتھ ساتھ ہر دور میں انسان کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ قدیم یونانی اور لاطینی زبانوں کے متون اور ان پر کام کرنے والے قدیم اور جدید محققین کی آرا سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں زبان نوع بہ نوع تبدیلیوں سے ہمکنار ہوتی رہی اور ان تبدیلیوں کو نہ صرف علمی و ادبی حلقوں بلکہ سماج میں بھی محسوس کیا جاتا رہا۔ زبان کے مطالعات کو کبھی ادب کے مطالعات کی ذیل میں ہی رکھا گیا اور کبھی اسے لفظوں کی اشتقاقی تاریخ تک محدود کر کے دیکھا گیا مگر اٹھارہویں صدی سے زبان کے مطالعات کو اختصاص کے ساتھ دیکھا جانے لگا۔ اس حوالے سے ایک اہم کام، نوآبادیاتی ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ایک جج اور ماہرِ لسانیات 'ولیم جونز' کے ہاتھوں ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام تھا۔ اس ادارے نے نہ صرف برصغیر بلکہ انگلستان اور یورپ میں بھی تاریخی لسانیات اور اس سے بھی آگے بڑھ کر باقاعدہ تقابلی لسانیات کو علمی و تحقیقی بنیادوں پر فروغ دیا۔

بیسویں اور اکیسویں صدی میں زبان کا مطالعہ ایک سائنس کے طور پر کیا گیا۔ اس کو لسانیات (Linguistics) کا نام دیا گیا۔ اس سے نہ صرف زبان کو ایک نظام تسلیم کرتے ہوئے اس کے مطالعات میں اختصاص اور گہرائی پیدا ہوئی بلکہ اس کے اساسی شعبوں مثلاً صوتیات، معنیات، صرفیات اور نحویات وغیرہ کو الگ الگ حیثیت میں بھی علمی تحقیق کا موضوع بنایا گیا۔ لسانیات نے بطور ایک باضابطہ علم، دیگر شعبہ ہائے علمی سے بھی اثرات قبول کیے اور دیگر شعبوں میں سامنے آنے والے نظریات سے اپنے ایوانوں کو منوّر کیا۔ اس حوالے سے ایک بہت بڑی تبدیلی، جس نے لسانیات کو بڑی حد تک متاثر کیا، وہ سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والے ماہرِ لسانیات فرڈی نینڈ سوشور کے زبان کے حوالے سے جدید نظریات تھے۔ سوشور نے بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ساختیاتی لسانیات کا تصوّر پیش کیا اور معنی سے زیادہ معنی پیدا کرنے والے نظام کو اہمیت دی۔

ہندوستان میں ولیم جونز کی ایشیاٹک سوسائٹی کے کام کو شخصی سطحوں پر مختلف لوگوں نے آگے بڑھایا۔ اداروں کی سطح پر اس حوالے سے دوسرا اہم نام کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کا ہے جس کے شعبۂ ہندوستانی کے سربراہ جان بارتھوک گلکرسٹ تھے۔

ہندوستان ایک نہایت وسیع و عریض جغرافیائی خطہ تھا جس میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ ان کے اپنے اپنے رسم و رواج، تہذیب اقدار اور زبانیں تھیں۔ جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تو انھوں نے نوآبادیاتی نظام کے استحکام کے لیے مقامی زبانوں کے علم کے حصول کو ضروری گردانا۔ ان کے لیے زبان کا علم، طاقت کے حصول اور نوآبادیاتی نظام کے استحکام کے لیے درکار طاقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایشیاٹک سوسوئٹی اور اس کے بعد فورٹ ولیم کالج نے ظاہری طور پر تو کلاسیکی متون کی پیشکش اور مقامی زبان و ادب کے فروغ کے لیے کام کیا مگر اپنے اصل مقصد کے حصول کی کوشش میں انھوں نے لسانی اور تہذیبی سطح پر ایک ایسا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا جس نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسلسل تقسیم در تقسیم کی ایک ایسی راہ پر گامزن کر دیا جس پر چلتے ہوئے، صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والی قوموں کے راستے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ یہ اہم تقسیم، زبان کی تقسیم تھی۔

اُردو۔ہندی: پس منظر اور اہم مباحث:

اردو اور ہندی کے حوالے سے انیسویں صدی کے تقریباً نصف اوّل سے شروع ہونے والے مباحث نے رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ تنازع کی صورت اختیار کر لی۔ اگر اس تنازعے کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو کچھ شخصیات اور واقعات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ گو کہ ان مباحث کا آغاز اس دور کے مستشرقین کی لغات اور کتب سے ہوتا ہے مگر اس زبان کے مسئلے کو اپنی اپنی ثقافتی شناخت اور

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

مذہب کے حوالے سے دیکھنے میں ہندو اور مسلمان خود بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ بنارس میں ہندی تحریک، ۱۸۷۸ء میں سامنے آنے والا بابو شیو پرساد کا میمورنڈم، ۱۸۹۳ء میں ناگری پرچارنی سبھا کا قیام، ۱۸۹۷ء میں شائع ہونے والی پنڈت مدن موہن مالویہ کی کتاب Court Character and Primary Education in the NWFP and Oudh ، ۱۸۹۸ء میں الہ آباد میں اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قیام، ۱۹۰۰ء میں اودھ کے لیفٹیننٹ گورنر سر اینٹونی میکڈانل کی جانب سے ہندوؤں کے دباؤ کے باعث شمال مغربی صوبہ جات اور اودھ کی عدالتوں میں ناگری خط کو اردو کے مساوی درجہ دینا، ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اُردو ہند کا علی گڑھ میں قیام، مولوی عبدالحق کے افکار اور کوششیں اور تقسیم کے بعد اردو ہندی کو دو مختلف راستوں پر گامزن کرنے میں دونوں طرف سرکاری سرپرستی میں ہونے والی زبان کی معیار بندی__ یہ تمام پہلو، ایک بڑے وسیع اور پیچیدہ منظر نامے کے محض چند اہم حوالے ہیں، جس نے ہندوستان میں صدیوں سے بسنے والی دو قوموں کو تہذیبی و لسانی محاذ پر آمنے سامنے لا کھڑا کیا۔ دونوں فریق انگریز کے نو آبادیاتی نظام کے سائے میں تشکیل اور تقویت پانے والی تقسیم کی پالیسی کا اس بُری طرح شکار ہوئے کہ آج بھی اس سوچ اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے مسلسل تقسیم در تقسیم کے عمل میں گرفتار نظر آتے ہیں۔

اُردو ہندی تنازع پر تفصیل سے بات کرنے کے لیے ان چند اہم مباحث پر توجہ دینا ضروری ہے، جو اس لسانی مسئلے کو ایک تنازع بناتے ہیں۔

اہم مباحث:

۱۔ اُردو اور ہندی، ایک زبان یا دو الگ زبانیں؟

(الف۔ کیا یہ پہلے الگ زبانیں تھیں مگر بعد ازاں ہندو امپیریلزم نے ہندی زبان کو برِصغیر کی اکثریتی نمائندہ زبان قرار دینے کے لیے اردو کی اہمیت سے انکار کیا اور اردو ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا؟

ب۔ کیا یہ پہلے ایک ہی زبان تھی اور مسلمانوں نے اپنی حاکمانہ ذہنیت اور علیحدگی پسند تعصب کی بنیاد پر اسے ہندی سے الگ زبان بنانے کی کوشش کی اور اسے بطور الگ زبان منوانا چاہا؟ لسانیات کیا کہتی ہے؟ وغیرہ۔)

۲۔ جدید ہندی اور اردو__ اوّلیت / قدامت کا مسئلہ

(اُردو کی ابتدا، جدید ہندی کی ابتدا، اُردو کے مختلف زمانوں میں مختلف نام وغیرہ)

۳۔ نو آبادیات: زبان کا تصوّر اور افتراق کا بیج (ولیم جونز کی ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج: نو آبادیاتی نظام کے وفادار ادارے، قوم اور مذہب کی بنیادی پر لسانی افتراق کی پالیسی)

۴۔ قومی تشخص کی سیاسی تحاریک اور زبان کا مسئلہ

(کیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے؟، مسلم اور ہندو تہذیب میں آمیزش اور آویزش کے رجحانات، ہندوؤں کی نمائندگی کا مسئلہ، اِحیائی تحریکیں اور جداگانہ تہذیبی تشخص کا احساس، تفریق کا ذمہ دار کون؟ وغیرہ۔)

۵۔ رسم الخط کا مسئلہ

(دیوناگری، فارسی عربی یا رومن۔ زبان کے ساتھ رسم الخط کے تعلق کا ثقافتی پہلو، جدید لسانیات میں digraphia اور biscriptality کے مباحث وغیرہ)۔

ذیل میں انھی اہم مباحث کی روشنی میں اُردو ہندی تنازع کو مزید تفصیل سے دیکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

اردو اور ہندی۔ ایک زبان یا دو الگ زبانیں:

اردو ہندی تنازع میں یہ سوال سب سے زیادہ اہم اور کلیدی نوعیت کا ہے۔ دونوں نقطہ ہائے نظر کے حامل ماہرینِ زبان و ادب نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلائل کے انبار لگا دیے ہیں، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک ایسے مسئلے کو سُلجھاتے ہوئے، جو بڑی حد تک لسانی تھا، دونوں فریقوں نے کہیں کہیں بے جا جذباتیت اور تحقیقی غیر سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ان تمام بحثوں نے مسئلے کو سلجھانے کی بجائے مزید پیچیدہ کر دیا ہے۔

اس اہم مسئلے کو سمجھنے کے لیے اسے دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک زاویہ زبان کی مختلف سطحوں کا تجزیہ کرنے سے عبارت ہے اور دوسرا جدید لسانیات کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے متعلق ہے۔

اس مسئلے کو عام فہم سطح پر سمجھنے کے لیے زبان کو ابلاغ کے حوالے سے تین مختلف سطحوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

عام بول چال کی سطح:

عام بول چال کی سطح پر اُردو اور ہندی میں اس قدر مماثلت پائی جاتی ہے کہ دلائل و براہین کے طومار سے انھیں الگ زبانیں ثابت کرنے کی کوشش کرنے والوں کی بے جا تحقیقی عرق ریزی پر رحم آنے لگتا ہے لیکن یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ ہر دو طرف کے ماہرین زبان اس حد تک بالعموم متفق نظر آتے ہیں کہ بول چال کی سطح پر اُردو ہندی ایک ہی زبان ہے۔ کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"اُردو اور ہندی میں بول چال کی سطح پر کوئی فرق نہیں۔"(۱)

مزید یہ بھی کہا ہے کہ

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جو بول چال کی ہندی ہی کو بول چال کی اردو کہتے ہیں۔"(۲)

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

گیان چند جین اپنی کتاب ایک 'بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' میں رائے دیتے ہیں:

"اُردو اور ہندی بات چیت کی سطح پر سو فیصدی ایک ہیں۔"(۳)

مرزا خلیل احمد بیگ، اپنی کتاب "ایک بھاشا... جو مسترد کر دی گئی" میں، جو دراصل گیان چند جین کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی، اسی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ بول چال کی سطح پر جو زبان کی نچلی سطح (Grass-root level) ہے، اُردو اور ہندی میں نمایاں فرق نہیں پایا جاتا اور یہ دونوں زبانیں اس سطح پر پہنچ کر تقریباً ایک ہو جاتی ہیں کیونکہ ان دونوں زبانوں کا ارتقا ایک ہی ماخذ سے ہوا ہے۔"(۴)

یوں ایک بات تو ثابت ہوتی ہے کہ عام بول چال کی حد تک اردو ہندی تنازع کا بنیادی سوال، عملی سطح پر اپنا جواب رکھتا ہے جو غالب ابلاغ کی صورت میں ہے۔

عام بول چال کی تحریری شکل:

دوسری سطح عام بول چال کی زبان کو ہی ضبطِ تحریر میں لانا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے اس ندی کا کنارہ شروع ہوتا ہے جو آگے چل کر ایک ناقابلِ عبور خلیج کا روپ دھار لیتی ہے۔ یہ اہم مقام رسم الخط کی تبدیلی ہے۔ اردو کے ساتھ فارسی رسم الخط اور ہندی کے ساتھ دیوناگری رسم الخط کو اس حد تک مخصوص کر دیا گیا ہے کہ تکلم کی سطح پر ایک دوسرے کی عام بات چیت کو سمجھ لینے والے، اسی تکلم کی تحریری صورت کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہی حال عام اطلاعات مثلاً اطلاعاتی / معلوماتی تختوں یا اشخاص اور مقامات وغیرہ کے ناموں کا ہے۔ یہ پہلو، ابلاغ کو بعض اوقات جزوی اور زیادہ تر کُلی طور پر متاثر کرتا ہے۔ سجاد ظہیر اپنے کتابچے 'اُردو، ہندی، ہندوستانی' میں لکھتے ہیں:

"اُردو اور ہندی اپنی موجودہ ادبی اور تحریری شکل میں الگ الگ ہیں حالانکہ ان کی نحوی ساخت بنیادی طور سے ایک ہے۔ بہر حال ان کا فرق ظاہر ہے اور اس فرق کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ ہماری کلچر کے دو متوازی دھاروں کی آئینہ دار ہے۔"(۵)

یقیناً یہ پہلی دراڑ، زبانوں کی ساخت یا ہیئت کے باعث نہیں بلکہ زبانوں کے مخصوص ثقافتی پس منظر کے باعث نمودار ہوتی ہے۔

علمی و ادبی زبان (تکلمی و تحریری):

ابلاغ کے حوالے سے زبان کی یہ تیسری سطح، درحقیقت زبان کے ایک یا الگ ہونے کے سوال کو مشکل اور پیچیدہ بناتی ہے۔ اس مقام پر تکلمی اور تحریری، ہر دو حوالوں سے ایک زبان کے بولنے والوں کا دوسری زبان بولنے اور پڑھنے لکھنے والوں سے ابلاغ کا موثر رشتہ استوار نہیں ہو پاتا۔ کہیں کہیں تو ابلاغ کا یہ خلا اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ دونوں الگ زبانیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔

اس سطح پر زبان کو مختلف بنانے والے عناصر میں دونوں زبانوں کا اپنے اپنے ثقافتی و تہذیبی ماحول سے بننے والے ذخیرۂ الفاظ، مخصوص مذہبی اور علمی اصطلاحات، سماجی شعبوں مثلاً سرکاری اطلاعات یا قانون کی لفظیات وغیرہ اور رسم الخط کا فرق شامل ہے۔

ایک سطح پر بالکل ایک معلوم ہونے والی یہ زبانیں آخری سطح پر اس قدر مختلف کیوں نظر آتی ہیں۔ سجاد ظہیر کے متذکرہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس افتراق کا باعث جداگانہ لسانی ساخت نہیں بلکہ مخصوص سماجی و تہذیبی پس منظر ہے۔

اب اسی اہم سوال کو جدید لسانیات کے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں لسانیات کی دو شاخوں توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) اور سماجی لسانیات (Sociolinguistics) کو ذہن میں رکھنا ہو گا۔

پہلے توضیحی لسانیات کو لیجیے کہ آج کل عام طور پر لسانیات سے توضیحی لسانیات ہی مراد لی جاتی ہے۔ مرزا خلیل بیگ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"عام مفہوم میں ہم 'لسانیات' سے توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) ہی مراد لیتے ہیں جو صرف زبانوں کی ساخت اور ہیئت کے مطالعے اور تجزیے سے سروکار رکھتی ہے۔ زبانوں کے مطالعے کا یہ انداز عدم سماجی (Asocial) کہلاتا ہے۔"(۶)

توضیحی لسانیات زبان کی نحوی ساخت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی صرفیات، معنیات اور صوتیات وغیرہ جیسی خصوصیات کا مطالعہ کرتی ہے اور انھی بنیادوں پر زبانوں کو تقسیم کرتی ہے۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ اپنی کتاب 'لسانیاتی مباحث' (۲۰۱۵ء) میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"زبانوں کی تقسیم اور ان کے باہمی رشتوں کا تعین ان کی صرف اور نحوی خصوصیات اور ساخت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ذخیرۂ الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔"(۷)

اگر لسانیات کی مندرجہ بالا تعریفوں کو پیشِ نظر رکھا جائے اور اردو اور ہندی کی بنیادی ساخت اور ڈھانچے پر غور کیا جائے تو لسانیات کا کوئی بھی سنجیدہ طالبِ علم، ہندی اور اردو کو دو الگ زبانیں قرار نہیں دے سکتا۔ لسانیات کی رُو سے کیے گئے اس استنتاج سے اردو اور ہندی کے کم و بیش تمام اہم ماہرینِ لسانیات اتفاق کرتے ہیں۔ مثلاً اردو اور ہندی کو الگ زبانیں قرار دینے والے مرزا خلیل احمد بیگ بھی اس لسانیاتی نکتے سے متفق ہیں۔

"اگرچہ لسانیات (= توضیحی لسانیات) کی رُو سے یہ ایک زبانیں ہیں۔"(۸)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"اردو اور ہندی دونوں ایک ہیں۔"(۹)

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

شمس الرحمن فاروقی اپنے مضمون، ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب میں لکھتے ہیں:

"میرا ابھی ہمیشہ سے یہی موقف رہا ہے کہ اردو اور جدید کھڑی بولی ہندی صرف سیاسی اور بعض تاریخی وجہ سے دو الگ زبانی قرار پائی ہیں ورنہ لسانیات کے اصول سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔"(۱۰)

خود گیان چند جین، جو اردو اور ہندی کے ایک زبان ہونے کے بہت بڑے داعی ہیں۔ پہلے پہل کہہ چکے ہیں کہ:

"صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ کھڑی بولی کے دونوں روپوں کا ادب اور لسانی سرمایہ اتنا مختلف ہو گیا ہے کہ انھیں دو زبانیں نہ ماننا حقیقت کی جانب سے آنکھیں موند لینا ہے۔"(۱۱)

لیکن ان کے اپنے بقول یہ ان کا اس وقت کا بیان ہے جب انھوں نے باقاعدہ لسانیات نہیں پڑھی تھی۔ اب وہ کہتے ہیں:

"اپنی کتاب 'عام لسانیات' کی تیاری کے لیے میں نے زبان اور بولی کے فرق کا مطالعہ تو یہ ماننے پر مجبور ہوا کہ اردو اور ہندی لسانیات کی رُو سے ایک ہیں۔"(۱۲)

یوں توضیحی لسانیات کی رُو سے تو ہندی اور اردو کو دو الگ الگ زبانیں قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اگر اسی مسئلے کو سماجی لسانیات (Sociolinguistics) کی روشنی میں دیکھا جائے تو زبان کے وہ پہلو جو توضیحی لسانیات کے میدان میں اہم نہ تھے مثلاً ذخیرۂ لفظی، اصطلاحات، ادبی رویے، لسانی پالیسی، تہذیبی شناخت وغیرہ، اچانک بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ڈیوڈ کرسٹل، A Dictionary of Linguistics and Phonetics میں Sociolinguistics کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"A branch of linguistics which studies all aspects of the relationship between language and society. Sociolinguists study such matters as the linguistic identity of social groups, social attitudes to language, standard and non-standard forms of language, the patterns and needs of national language use, social varieties and levels of language, the social basis of multilingualism and so on."(13)

ڈیوڈ کرسٹل کی اس تعریف سے سماجی لسانیات کے وسیع سماجی و تہذیبی دائرۂ کار کا بخوبی انداز ہوتا ہے۔ مرزا خلیل بیگ، سماجی لسانیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"زبانوں کے اس نوع کے مطالعے کی بنیاد زبانوں کے سماج اور تہذیب کے ساتھ گہرے رشتوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس مطالعے میں کسی لسانی طبقے (Speech Community)، نیز اس کے لسانی تشخص (Language Identity)، اور زبان کے سماجی وظائف (Social Functions) اور تہذیبی قدروں (Cultural Values) کو بہ طور خاص ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔"(۱۴)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو اور ہندی کے جداگانہ سماجی سیاق سے تعلق کی بنا پر سامنے آنے والی مخصوص صورتِ حال کو سماجی لسانیات کے زاویے سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے مرزا خلیل بیگ لکھتے ہیں:

"اردو اور ہندی کا آغاز اگرچہ ایک ہی ماخذ سے ہوا ہے اور بنیادی ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے یہ دونوں مماثل (Identical) زبانیں ہیں لیکن اپنے ارتقا اور نشوونما کے مراحل میں بعض وجوہ سے یہ ایک دوسرے سے دُور جا پڑی ہیں کہ ان کے سماجی سیاق و سباق، تاریخی و تہذیبی حوالوں اور قدروں، ثقافتی وظائف نیز مزاج میں قابلِ لحاظ فرق پیدا ہو گیا ہے۔"(۱۵)

سماجی لسانیات کی رُو سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ زبان کا 'عدم سماجی' ہی نہیں، بلکہ سماجی مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اگر ہندی اور اردو کا موازنہ اس حوالے سے کیا جائے تو ہر دو زبانوں کا مخصوص سماجی، تہذیبی اور ثقافتی منظر نامہ اور اس کے ان زبانوں کے ارتقا پر اثرات، ان کو بڑی حد تک دو مختلف زبانوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس امتیاز کو صرف خلیل بیگ ہی محسوس نہیں کرتے بلکہ ظاہراً ان سے متضاد نظریہ رکھنے اور ہندی اردو کو ایک زبان سمجھنے والے گیان چند جین بھی محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"آپ مجھ سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کے تشخص کا جو اظہار اردو زبان و ادب میں ہوتا ہے وہ ہندی میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہندوؤں کے تہذیبی تشخص کا جو اظہار ہندی زبان و ادب میں ہوتا ہے، اس قدر اردو میں نہیں ہوتا۔"(۱۶)

اب اگر ان دلائل کو، جو توضیحی اور سماجی لسانیات کے حوالے سے دونوں اطراف سے پیش کیے جاتے ہیں، ذرا غور سے دیکھیں تو ایک نہایت دلچسپ صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو بات گیان چند جین نے ایک زبان ہونے کے حوالے سے کی، تقریباً وہی مرزا خلیل بیگ اور شمس الرحمن فاروقی نے بھی کی ہے اور زبان کے جس امتیاز کی بنیاد پر خلیل بیگ اردو کو ہندی سے مختلف قرار دیتے ہیں، اس امتیاز کے گیان چند جین بھی قائل ہیں۔ تو آخر یہ دونوں طرف کے لوگ ایک جیسے لسانی حقائق کو پیش کر کے اور ان کو تسلیم کرتے ہوئے، انھی حقائق سے دو متضاد نتائج کا استخراج کیسے کر لیتے ہیں؟ توضیحی اور سماجی لسانیات کی مذکورہ بالا بحث میں ہی اس کی کلید چھپی ہے اور وہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے حامل لوگوں کا تناظر ہے۔ جو لوگ اردو ہندی کے ایک زبان ہونے کے قائل ہیں، وہ ان زبانوں کو توضیحی لسانیات کے تناظر میں دیکھتے ہیں مثلاً گیان چند جین، کمال احمد صدیقی وغیرہ۔ اس کے برعکس جو لوگ اردو اور ہندی کو دو الگ زبانیں قرار دیتے ہیں، وہ ان کا مطالعہ سماجی لسانیات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ یوں ایک ہی طرح کے حقائق، مختلف تناظر کے باعث، مختلف یا متضاد نتائج تک پہنچنے کے لیے دلیل کا کام کرتے ہیں۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اس نکتے پر پہنچ کر مسئلے کی پیچیدگی کی ایک سطح ہم پر واضح ہوتی ہے۔ لیکن یہاں بحث کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس سے زیادہ اہم اور بڑا سوال سر اٹھاتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ زبان کے ان سماجی مطالعات میں نظر آنے والا یہ واضح اور صریح فرق، جسے دونوں نقطہ ہائے نظر کے لوگ تسلیم کرتے ہیں، کب، کیسے اور کیوں کر پیدا ہوا۔ آگے آنے والے مباحث میں ہم اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر اس سے پہلے ہندی اردو تنازع کے ایک اور اہم مسئلے کو دیکھتے ہیں۔

۲۔اردو۔ جدید ہندی، اوّلیت / قدامت کا مسئلہ:

اردو ہندی تنازع نے جہاں اردو اور ہندی بولنے والوں کو دو متحارب گروہوں کی صورت میں ایک دوسرے کے مدمقابل لا کھڑا کیا، وہیں ان مباحث کی بدولت کہیں کہیں اردو زبان سے متعلق ان سوالات پر بھی توجہ دی گئی جو بصورتِ دیگر کسی نہ کسی حد تک نظر انداز رہتے۔ ان میں سے ایک اہم سوال اردو اور ہندی کی قدامت کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا تعلق اردو اور جدید ہندی کے آغاز وارتقا سے ہے۔

اردو کے آغاز کے حوالے سے بہت سے ماہرینِ زبان نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ کسی نے اس کا ماخذ پنجاب کو، کسی نے سندھ کو، کسی نے ہریانوی کو اور کسی نے دکن کو قرار دیا، ان نظریات میں کہیں کہیں لسانی نقطۂ نظر سے ایک غلط تصور رواج پا گیا کہ برِ صغیر میں آنے والے مسلمانوں کی زبانوں کے یہاں کی مقامی زبانوں کے ساتھ ملاپ کے نتیجے میں ایک نئی زبان اردو کی صورت میں سامنے آئی۔ یوں یہ کھچڑی یا لشکری زبان ہے۔ لسانیاتی حوالے سے یہ غلط تصور ہے خواہ اس کا پرچار کرنے والوں میں میر امن جیسے صاحبِ طرز انشاپرداز ہی کیوں نہ شامل ہوں۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ اس حوالے سے Max Muller اور شوکت سبزواری کے خیالات کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ خیال سراسر غلط اور لسانی بحثوں میں حقیقت سے بھٹکانے والا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو جوڑ کر کوئی نئی تیسری زبان بنائی جاسکتی ہے۔
کوئی زبان آس پاس کی زبانوں اور بولیوں سے غذا حاصل کر کے اور ان کی فضا میں سانس لے کر توانائی تو حاصل کر سکتی ہے لیکن کسی زبان کے لیے
یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی دوسری زبان سے مل کر ایک تیسری زبان بنالے۔"(۱۷)

چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی آمد سے مخصوص کرنا، کُلّی طور پر درست اندازِ نظر نہیں ہے۔ اردو کے اہم اور بڑے ماہرینِ لسانیات میں اس حوالے سے اتفاق پایا جاتا ہے کہ اردو ہندوستان کی مقامی زبان ہے جس کی جڑیں پراکرت اور سنسکرت میں ہیں۔ اس نظریے کو اگر سادہ لفظوں میں بیان کیا جائے تو کچھ یوں ہے کہ سنسکرت، ہندوستان کی قدیم زبان تھی۔ اس نے تقریباً ۱۵۰۰ق م میں اپنے ارتقائی سفر کا آغاز کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس سنسکرت سے بہت سی پراکرتیں نکل آئیں۔ ان پراکرتوں سے بہت سی اپ بھرنشیں نکلیں اور اپ بھرنشوں سے بہت سی بولیاں۔ ان میں سے اردو کس پراکرت کی کس اپ بھرنش اور اس کی کس بولی سے صورت پذیر ہوئی، اس کے بارے میں مختلف آرا موجود ہیں۔ ایک رائے شورسینی پراکرت اور شورسینی اب پھرنش کے حق میں ہے۔ لیکن ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے مطابق اس نظریے کو قبول کرتے ہوئے اردو کے کھڑی بولی سے ارتقا پانے کے نظریے کو مسترد کرنا پڑتا ہے۔ اگر کھڑی بولی کے نظریے کو تسلیم کر لیا جائے جو بڑی حد تک قرینِ قیاس ہے تو اس کی ماخذ اپ بھرنش کا سوال قائم رہتا ہے۔ اس سوال کا حتمی جواب نہ سامنے آنے کی بنیادی وجہ مختلف پراکرتوں سے بننے والی اپ بھرنشوں کی اقسام، ان کے ناموں اور علاقوں کے حوالے سے پائی جانے والی محدود معلومات اور ان میں موجود شدید اختلافِ رائے ہے۔ بہر حال دستیاب معلومات اور لسانیاتی تحقیق کی روشنی میں اس نظریے کو کسی حد تک قبول کیا جاسکتا ہے۔

جب مسلمان بارہویں صدی کے اواخر میں دلی میں داخل ہوئے تو اسی اپ بھرنش کی ایک تحتی بولی یعنی 'کھڑی بولی' نواحِ دہلی میں رائج تھی۔ مرزا خلیل بیگ کے مطابق:

"اسی کھڑی بولی میں جب عربی فارسی (اور ترکی) الفاظ کی آمیزش ہوئی تو اس کا نام اردو پڑا۔"(۱۸)

یہی وہ کھڑی بولی ہے جو بلاواسطہ طور پر اُردو اور بالواسطہ طور پر جدید ہندی کا ماخذ قرار پاتی ہے۔ جدید ہندی تو خیر اس وقت وجود ہی نہیں رکھتی تھی مگر اردو کا نام بھی اردو نہیں تھا۔ مسلمانوں کی زبانوں کے اثرات قبول کر کے اپنی مقامی ساخت پر ارتقا پاتی ہوئی اس زبان کا نام ہندی، ہندوی، ہندوستانی، انڈوستانی، ریختہ اور دہلوی وغیرہ رہا ہے۔ اس زبان کے لیے 'اردو' کا لفظ بطور اسم زبان اٹھارہویں صدی کے ربع آخر سے پہلے نہیں ملتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زبان بھی نام کے ساتھ ہی وجود میں آئی۔ زبان کا ارتقائی سفر مختلف ناموں کے ساتھ طویل عرصے سے جاری تھا۔

اس کے برعکس جدید ہندی کا آغاز بہت بعد میں یعنی ۱۸۰۰ء کے بعد ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں قائم ہونے والے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے سربراہ جان گلکرسٹ کے کہنے پر کالج کے 'بھاکا منشی' للّولال کوی نے 'شریمت بھاگوت' کے دسویں کھنڈ کی کتھا 'پریم ساگر' کے نام سے ۱۸۰۳ء میں لکھی۔ للّولال کوی نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے گلکرسٹ کے کہنے پر دانستہ فارسی وعربی لفظیات سے اجتناب کیا اور ان کی جگہ سنسکرت کے متبادل لفظ استعمال کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ للّولال نے یہ کتاب دیوناگری رسم الخط میں لکھی۔ زبان کا یہ انداز ایک نیا تجربہ تھا جس نے بعد میں رواج حاصل کر لیا اور جدید ہندی یا کھڑی بولی ہندی کے نام سے معروف ہوا۔ بہت سے یورپی اور خود ہندو ماہرینِ زبان کی رائے یہی ہے کہ جدید ہندی کی عمارت، اردو کی بنیادوں پر استوار کی گئی۔ ایودھیا پرساد کھتری لکھتے ہیں:

"اردو میں سے عربی فارسی کو جان بوجھ کر خارج کرنے اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے ٹھیٹھ الفاظ رکھنے سے موجودہ مصنوعی ہندی کا ارتقا عمل میں
آیا ہے۔"(۱۹)

یہی بات ۱۸۹۲ء میں جارج گریئرسن، ۱۹۱۵ء میں فریزر اور ۱۹۲۰ء میں فرینک ای کی نے کی۔(۲۰) گیان چند جین ان آرا سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پریم ساگر سے قبل کھڑی بولی ہندی کے نمونے مل جاتے ہیں مگر وہ کھڑی بولی ہندی میں برج بھاشا جیسی دیگر بولیوں کے سرمائے کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود بقول مرزا خلیل بیگ ان کی دی ہوئی مثالیں استناد کا درجہ نہیں رکھتیں۔

مندرجہ بالا بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ جدید ہندی پر اردو کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو جس اصول کے تحت مسلمانوں نے کھڑی بولی میں عربی وفارسی لفظیات داخل کر کے اردو کی صورت پذیری میں حصہ ڈالا، اسی اصول کے تحت کھڑی بولی کی ساخت پر استوار اردو میں سے فارسی وعربی لفظیات نکال کر ٹھیٹھ سنسکرت کے الفاظ داخل کر کے، جدید کھڑی بولی ہندی کے اسلوب کو

رواج دیا گیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو، جدید ہندی سے قدیم ہے اور پہلے سے موجود تھی۔ اسی طرح ان حقائق کی روشنی میں اردو کو ہندی کی شَےلِی (اسلوب) قرار دینا غلط ہے بلکہ صورتِ حال بڑی حد تک اس کے برعکس ہے۔

نو آبادیات: زبان کا تصوّر اور لسانی افتراق کا بیج:

اٹھارہویں صدی کے وسط تک انگریز برِصغیر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکے تھے۔ کلکتہ اور بنگال کو اپنی نو آبادیاتی سرگرمیوں کا مرکز بناتے ہوئے انھوں نے وہاں کے نظم و نسق کے نظام پر اختیار حاصل کر لیا۔ انگریز یہ بات جان چکے تھے کہ وہ تب تک برصغیر میں اپنا تسلط مستحکم نہیں کر سکتے جب تک مقامی زبان اور اس کے راستے مقامی تہذیب و ثقافت تک رسائی نہ حاصل کر لیں۔ اس حوالے سے دو شخصیات کا نام اہم ہے، ولیم جونز اور جان بار تھوک گلکرسٹ۔ گو کہ ان کے علاوہ بھی انفرادی کوششیں سامنے آئیں مگر ان دو شخصیات نے برِصغیر میں اپنی قوم کے نو آبادیاتی مفادات کو بڑی تقویت پہنچائی۔ ولیم جونز نے اپنی قائم کردہ ایشیاٹک سوسائٹی میں مقامی علم و ادب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس کی دلچسپی قدیم کلاسیکی متون سے تھی۔ یہ 'تاریخ' اور 'اصل' تک رسائی کا ذریعہ تھے۔ جان بار تھوک گلکرسٹ نے زبان کے عام تکلمی یعنی Vernacular پہلو پر توجہ دی۔ لغات تیار کیں اور فورٹ ولیم کالج میں شعبۂ ہندوستانی کے سربراہ کے طور پر برطانوی فوج کے نئے آنے والے افسروں کے لیے نصابات تیار کروائے۔ بظاہر لگتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات زبان و ادب سے دلچسپی اور محبت کی بنا پر کیے گئے مگر حقیقت میں تصویر کا اصل رُخ، اس عام تسلیم شدہ رُخ سے مختلف ہے۔ ساج اور تہذیب کا نو آبادیاتی مطالعہ کرنے والے ناقدین کو اعتراض ہے کہ ولیم جونز اور گلکرسٹ صرف اور صرف اپنے ذاتی مفادات اور اپنی حکومت کے ایک بڑے نو آبادیاتی فریم ورک کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ گلکرسٹ خود لکھتا ہے:

"ہندوستان میں میرا قیام، خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ تو میرے ہی لیے خوشگوار ہو سکتا ہے اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس ملک کی مروّجہ زبان میں پوری دست گاہ نہ حاصل کر لوں۔"(۲۱)

چنانچہ اپنے آقاؤں کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اور زبان کی مدد سے طاقت کا کلامیہ تشکیل دیتے ہوئے اس نے زبان کی تقسیم کا بیج بویا۔ پہلے خود ہندوستان کی لنگوا فرانکا (اردو) کے لیے ہندوستانی کا نام تجویز کیا اور اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان قرار دیا۔ پھر ہندوی کے نام سے ہندوستان کی قدیم زبان کو ہندوؤں کی زبان قرار دیا۔

'ہندوی' (Hinduwee) کو میں بلا شرکتِ غیرے ہندوؤں کی ملکیت قرار دیتا ہوں۔"(۲۲)

زبان کی لسانی نہیں بلکہ قومی و مذہبی بنیادوں پر تقسیم کا یہی نظریہ اس کے ذہن میں موجود تھا جب اس نے میر امن کو معرّب و مفرّس اسلوب میں باغ و بہار اور للّو لال کوی کو عربی و فارسی الفاظ سے عاری زبان میں پریم ساگر لکھنے کے لیے کہا۔ اس کی یہ کوشش خاصی کامیاب رہی کیونکہ اس کے بعد ہی زبان کو مذہب اور تہذیبی تشخص کے ساتھ جوڑنے کا ایسا رجحان سامنے آیا جس نے صدیوں میں تشکیل پانے والی مشترکہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور معاشرتی وحدت کو تار تار کر دیا۔ گلکرسٹ خود لکھتا ہے:

"انجام کار ہندو لوگ قدرتی طور پر ہندوی کی طرف جھکیں گے اور مسلمان لامحالہ عربی اور فارسی کی طرف۔"(۲۳)

اب اگر اس بیان کے ساتھ گیان چند جین کا اکیسویں صدی کا بیان رکھ کر دیکھا جائے تو اردو ہندی تنازع پر نو آبادیاتی اثر واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے:

" آپ مجھ سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کے تشخص کا جو اظہار اردو زبان و ادب میں ہوتا ہے وہ ہندی میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہندوؤں کے تہذیبی تشخص کا اظہار جو ہندی زبان و ادب میں ہوتا ہے اس قدر اردو میں نہیں ہوتا۔ اردو زبان و ادب کا لسانی و تہذیبی پس منظر عربی، فارسی اور اسلام سے نزدیک ہے، ہندی زبان و ادب کا سنسکرت اور ہندو دھرم ہے۔"(۲۴)

کیا یہ گلکرسٹ کی محض دور اندیشی تھی یا اس کا ایک اہم مقصد، جو اس کے اور اس کے آقاؤں کے حق میں انتہائی مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اردو اور ہندی کی یہ تقسیم انیسویں صدی کے اواخر تک نصابات کو بھی متاثر کرنے لگی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں اودھ کے مہتمم تعلیماتِ عامہ نے بجا طور پر اپنی رپورٹ میں اعتراض اٹھایا کہ اردو درسی کتب لکھنے والے اپنی کتب اودھ کی مقامی بول چال کی زبان یعنی ہندوستانی یا اردو میں ترتیب دیتے ہیں جب کہ ہندی درسی کتب میں عام اشیا اور خیالات کے لیے بھی سنسکرت سے تعلق رکھنے والے ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو صدیوں سے متروک ہو چکے ہیں۔ اس کے درج ذیل الفاظ سے نو آبادیاتی حکمتِ عملی کی وضاحت ہو جاتی ہے:

"But instead of encouraging and attempting to widen the common element, we have been doing our utmost to widen the differences and to create, under the name of Hindi, a language which no one speaks, and which no one, unless he is specially educated, can interpret." (25)

زبان اور تہذیب میں قدامت اور اصل کی اہمیت کو فروغ دینے والے اداروں اور لسانی افتراق کو بڑھانے والی تعلیمی و لسانی پالیسیوں نے برِصغیر کی دو بڑی قوموں کو کیسے متاثر کیا، عزیز احمد کی زبان سنیے:

"یورپی مستشرقی علوم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے ماضی کے مطالعے کی راہیں مقرر کرنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس عمل میں دونوں نے الگ الگ معذرت خواہیوں اور احیا پرستی کے اپنے اپنے نظاموں کی طرح ڈالی۔ احیا پرستی کے یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔"(۲۶)

اسی پس منظر میں ہندوستان میں قومیت کی تحریکوں اور مذہبی و تہذیبی احیا پرستی کی کوششوں میں شدت آنے لگی۔

قومی تشخص کی سیاسی تحاریک اور زبان کا مسئلہ:

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ یوں تو محمد بن قاسم کے سندھ فتح کرنے سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھامگر ہندوستان کی مختلف اقوام کے ساتھ مسلمانوں کا یہ ربط بڑی حد تک محدو د تھا۔محمو دغزنوی کے حملوں اور فتوحات کے نتیجے میں گیارہویں اور بارہویں صدی میں جہاں اسلامی سلطنت کو وسعت ملی وہاں پر برصغیر کی متنوع تہذیبی فضا پر نئے تہذیبی عناصر کی اثر اندازی میں بھی اضافہ ہوامگر تہذیبی و ثقافتی سطح پر ہونے والا ارتباط کبھی یک طرفہ نہیں ہوتا۔چنانچہ دونوں تہذیبوں نے ایک دوسرے کے اثرات قبول کیے۔اس ثقافتی میل جول سے عہد مغلیہ تک آتے آتے ایک مشترکہ ہندایرانی تہذیب کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوئے۔ سماج اور تہذیب کے دیگر مظاہر کی طرح زبان بھی اپنے آپ کو ان اثرات سے دور نہ رکھ سکی۔برصغیر کی مقامی زبانوں اور بولیوں نے عربی، فارسی اور ترکی جیسی زبانوں کے اثرات کو قبول کیااور اپنا بنیادی ڈھانچہ قائم رکھتے ہوئے نئے ذخیرہ الفاظ کو اپنے اندر سمو لیا۔یوں اس تہذیبی و ثقافتی اخذواستفادے کے نتائج زبان کے ایک نئے روپ کی صورت میں سامنے آئے۔اس نئی زبان کا وجود میں آنا ہی اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ مذہب، اقدار و روایات، رہن سہن اور معاشرتی وظائف کی انجام دہی کے ضابطوں میں اختلاف کے باوجود حاکم اور محکوم تہذیب میں بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔اس ہم آہنگی کو پیدا کرنے میں کسی ریاستی جبر سے زیادہ ان معاشرتی عوامل کا دخل تھا جو ہمیشہ آمیزش اور آویزش کے رجحانات کے درمیان خاموشی سے کار فرما رہتے ہیں اور ممکنہ حد تک بعض تہذیبی عناصر کو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ وہ دونوں تہذیبوں کے لئے قابل قبول بن جاتے ہیں۔اس حوالے سے مسلمان صوفیا اور ہندوسادھوؤں کے افکار کا کردار بالخصوص نہایت اہم ہے۔انہوں نے انسان دوستی، رواداری،احترام آدمیت اور صلح کل کی اقدار کی تعلیم دی اور دو بظاہر مختلف بلکہ ایک حدتک متضاد تہذیبی خصائص کی حامل اقوام کے درمیان اشتراک کی راہیں ہموار کیں۔اسی مشترکہ تہذیب یا قومیت کے متعلق ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کی کثرت میں وحدت اوروحدت میں کثرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔اس کی رنگارنگی میں یک رنگی ملتی ہے۔اس کے گوناگوں نوادر میں ایک ہی روشنی کا ظہور دکھائی دیتا ہے۔اس کے صوفیوں، سنتوں اور سادھوؤں کے نغمے اور گیت چاہے کتنے ہی ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوں لیکن ان کی لَے ایک ہی ہے۔۔۔ مسلمان سماجی طور پر چاہے اپنے رسم ورواج کتنے ہی اسلامی کیوں نہ لائے ہوں اور ہندوؤں کی اپنی ریتیں، رسمیں خواہ کتنی ہی ہندوانہ کیوں نہ رہی ہوں لیکن برسوں کے ارتباطِ باہمی سے نہ مسلمانوں کے وہ رواج رہے اور نہ ہندوؤں کی وہ رسمیں،دونوں طبقوں کے ثقافتی امتزاج سے جوایک تیسری چیز وجود میں آئی وہی "مشترکہ ہندوستانی تہذیب" کہلائی۔" (۲۷)

اس مشترکہ تہذیب نے زبان کے ساتھ ساتھ علم و ادب کو بھی متاثر کیا۔دونوں تہذیبیں اپنا اپنا وقیع ادبی سرمایہ رکھتی تھیں۔اس مشترکہ ثقافتی منظر نامے میں سامنے آنے والی نئی زبان نے دونوں تہذیبوں کے طاقتور عناصر کے دلفریب رنگ یکجا کر دیئے۔شعری و نثری اصناف میں موضوعات اور اسلوب کی سطح پر ایک دوسرے سے اثرات قبول کیے گئے۔دکن میں ولی کے ہاں مقامی اور فارسی اثرات کے امتزاج سے لے کر انیس اور داغ کی سخن کاری تک میں اسی مشترکہ تہذیبی روایت کے رنگوں کا طلسم نظر آتا ہے۔یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ خواہ تشبیہات، استعارات، تراکیب اور تلازمے کی سطح پر فارسی عربی اثرات نمایاں رہے مگر اس تخلیقی تجربے سے گزرنے والے تخلیق کار نے اپنا تعلق مشترکہ ہندوستانی تہذیب سے ہی استوار رکھا۔اس کے فکری رویے، بیانیہ لہجہ، رسوم و رواج کی پیشکش اور بڑی حد تک روزمرہ اور محاورات کا تعلق اسی امتزاجی تہذیب کے اثرات کا حامل تھا۔اسی کے نتیجے میں ایک طرف مسلمان شاعروں کے ہاں بارہ ماسہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی مثالیں ملتی ہیں اور دوسری طرف ہندو شاعر بھی مثنویات کا آغاز مسلمانوں کی طرز پر حمد و نعت سے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔الغرض ایک ایسے تہذیبی ورثے کی تشکیل ہوتی ہے جس میں ہندمسلم تہذیب کے اثرات کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

ان آمیزش کے رویوں کے ساتھ ساتھ دونوں اقوام میں مذہبی و معاشرتی سطح پر اپنی الگ شناخت قائم رکھنے کی کوشش بھی نظر آتی ہے۔دونوں طرف اس تہذیبی انضمام کا گہرا ادراک موجود تھا اور اقدار و روایات بالخصوص مذہبی عقائد و عبادات کو ان کی اصل پر برقرار رکھنے کی کوششیں بھی سامنے آتی رہیں۔چنانچہ اس کی ایک جھلک ہمیں اٹھارہویں صدی میں سامنے آنے والی اصلاحِ زبان کی کوششوں میں نظر آتی ہے جن کے تحت اردو میں موجود مقامی الفاظ کو ترک کرنے اور ان کی جگہ مفرس و معرب ذخیرہ لفظی اختیار کرنے پر اصرار کیا گیا ۔ گویا مخصوص تہذیبی تناظر میں زبان کی معیاربندی کی کوشش کی گئی۔(۲۸) اسی طرح ہندوں کے ہاں سامنے آنے والی بھگتی تحریک اور مسلمانوں کے ہاں فرائضی تحریک نے مذہبی اصلاح کے ساتھ ساتھ دونوں اقوام کی انفرادیت کو بھی ابھارا۔ مگر ان کوششوں کے پس منظر میں دونوں اقوام کے درمیان ہنوز تعصب کی کار فرمائی نہ تھی۔انیسوں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور ہندوستان کے براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں چلے جانے سے برصغیر کے سماجی منظر نامے پر دیر رس اور دوررس نتائج مرتب ہوئے۔وہ علیحدگی پسند یا متعصبانہ رجحانات جو ہندوؤں کے اکثریت میں ہونے کے باوجود مسلم دور حکومت میں کسی حد تک دبے ہوئے تھے، وہ کھل کر سامنے آنے لگے۔ پہلے فارسی اور پھر اردو سے جڑے معاشی فوائد اور ملازمت کے مواقع ، جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بھی ان زبانوں میں دلچسپی کا اہم محرک ثابت ہوئے تھے، بعد ازاں ملازمتوں کے حصول کی مسابقت میں اردو اور ہندی کے درمیان تعصب کا سبب بن گئے۔(۲۹) ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریز حکومت کی جانب سے مسلمانوں کو بطور قوم سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی استبداد کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے برعکس ہندوؤں پر نوازشات اور مہربانیوں کے سلسلے کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کو بحیثیت قوم اپنی بقا اور دفاع کی فکر ہوئی۔

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

۱۸۶۸ء میں بنارس کے ہندوں کی جانب سے اردو کی شدو مد کے ساتھ مخالفت اور ہندی کی حمایت سے یہ تہذیبی بحران مزید شدت اختیار کر گیا۔ یہی وہ موقع تھا جس پر الطاف حسین حالی کے بقول سرسید احمد خان نے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپئیر سے کہا تھا "یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندوؤں مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کیلئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"(۳۰)

گو کہ انگریز سامراج کی جانب سے برصغیر کی تہذیبی یگانگت کو توڑنے کی کوششوں کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہی ہو چکا تھا مگر انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے نہ صرف ان اقدامات میں شدت آگئی بلکہ ایک ثقافتی انتشار کی صورت میں ان کے ثمرات بھی نظر آنے لگے۔ چنانچہ مسلمانوں میں دوقومی نظریے کا فروغ ہوا۔انہوں نے اپنی تہذیبی شناخت کو قائم رکھنے اور اپنے سیاسی و سماجی حقوق کے تحفظ کے لئے۱۹۰۶ء میں الگ سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی۔دوسری جانب انتہا پسند ہندوؤں کے ہاں شدھی اور سنگھٹن جیسی تعصب انگیز اور مسلم دشمن تحریکوں کا آغاز ہو گیا۔ گاندھی نے اردو اور ہندی کی تقسیم میں موجود،برصغیر کی دو بڑی اقوام کے درمیان دوری بڑھ جانے کے خدشے کے پیش نظر "ہندوستانی زبان"کی اہمیت پر زور دیا، جس میں نہ فارسی و عربی کے اثرات کا غلبہ ہو اور نہ ہی بھاشا یا سنسکرت کے عناصر غالب ہوں۔رسم الخط کے سلسلے میں تب بھی ابہام کی کیفیت رہی۔بالآخر ہندومسلم اتحاد کے خواہاں لوگوں کے خیالات علیحدگی پسند رجحانات رکھنے والوں کے سامنے دبتے چلے گئے۔سیاسی انتشار اور دونوں قوموں کے درمیان روز بروز بڑھتے عدم اعتماد نے مسلمانوں کو ایک جداگانہ وطن کے مطالبے پر ابھارا اور یوں الگ مذہب، معاشرتی اقدار اور تہذیبی شناخت کی بنیاد پر مسلمانوں نے طویل جدوجہد کے بعد اپنے لیے ایک آزاد وطن حاصل کر لیا۔

تقسیم کے بعد بھی دونوں طرف قومیت کے مباحث موجود رہے اور ان کی روشنی میں زبان کی معیار بندی کی کوششیں سامنے آئیں۔ پاکستان میں پاکستانی تہذیب و ثقافت اور قومیت کی تشکیل کے حوالے سے بحث کا آغاز ہوا۔پاکستان میں اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔دوسری طرف ہندوستان میں اردو ایک اقلیت کی زبان قرار پائی۔خود جواہر لال نہرو نے اردو پر ہندی کے بڑھتے ہوئے اثرات اور آل انڈیا ریڈیو کی نشریات میں ہندی الاصل الفاظ کی کثرت کی طرف توجہ دلائی۔(۳۱)

پاکستان میں بھی اردو کی عربی و فارسی اساس کو مقدم رکھتے ہوئے نفاذ اردو کی کوششیں ہوتی رہیں۔رسم الخط کے اختلاف کے ساتھ ساتھ جداگانہ تہذیبی اثرات کے حامل ذخیرہ الفاظ کے استعمال نے اردو اور ہندی کے درمیان تفاوت میں مزید اضافہ کر دیا۔ آج بھی دونوں طرف اردو اور ہندی کو دفتری اور سرکاری زبان بنانے کیلئے اپنے اپنے لسانی سرمائے کو استعمال میں لا کر اصطلاحات وضع کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

رسم الخط کا مسئلہ:

ہندی۔اردو تنازع کا ایک نہایت اہم پہلو رسم الخط کا مسئلہ تھا۔اس نے ہندی اردو تنازع کے آغاز سے ہی اہمیت حاصل کر لی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس مسئلے نے اردو ہندی کشیدگی میں مہمیز کا کام کیا۔بہار میں اردو کی بجائے ہندی کو تحریری بیان دینے کے لیے رائج کرنا،ہندوؤں کا دیوناگری رسم الخط کی حمایت میں انگریزی حکومت پر دباؤڈالنااور ۱۹۰۰ء میں انٹونی میکڈانل کی جانب سے شمالی مغربی صوبہ جات اور اودھ میں اردو کے ساتھ ساتھ،دیوناگری رسم الخط کو رائج کرنا،ایسے اقدامات تھے جنھوں نے اردو ہندی تنازع میں مزید شدت پیدا کر دی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ان اثرات نے جو فورٹ ولیم کالج میں پریم ساگر کی مدد سے نئے اسلوب کی بنیاد رکھنے کے باعث مرتب ہونا شروع ہوئے تھے،باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔چڑجی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "قوم پرستانہ اور وطن پرستانہ مزاج رکھنے والے اور سنسکرت سے محبت کرنے والے ہندو سوچ سمجھ کر ناگری رسم خط میں لکھی جانے والی سنسکرت آمیز ہندی کی جانب مائل ہونے لگے۔اس سلسلے میں انہیں بنگال اور پنجاب ('آریہ سماج') سے بہت مدد ملی... دھیرے دھیرے ہندو یہ محسوس کرنے لگے کہ ناگری رسم خط کا احیا بہت ضروری ہے۔"(۳۲)

بابو شیو پرشاد نے اپنے ۱۸۶۸ء کے میمورنڈم بہ عنوان Court Characters in the Upper Provinces of India کا اختتام ان الفاظ سے کیا:

> "جس طرح اس نے[حکومت نے]پہلے فارسی زبان کو خارج کیا تھا۔اسی طرح وہ عدالتوں سے فارسی رسم خط کو ختم کر کے ہندی کو نافذ کرے۔اس سے بہت سے فائدے ہوں گے... اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ 'ہندومت' کی بازیابی ہو گی۔"(۳۳)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے ہندی زبان(کھڑی بولی ہندی)اور دیوناگری رسم الخط کو اپنی تہذیبی شخصیت کا جزوِلاینفک تسلیم کر لیا اور اردو زبان اور رسم الخط کے خلاف نفرت آمیز رویّے کو اپنا شعار بنالیا۔ ۱۸۹۳ء میں دیوناگری رسم الخط کے احیا کے لیے باقاعدہ" ناگری پرچارنی سبھا" کے نام سے تحریک کا آغاز کیا گیا۔

ان حقائق کا اگر لسانیات کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو وہی فرق سامنے آتا ہے جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

> "ایک بات واضح ہے کہ زبان کالازمی رشتہ رسم خط سے نہیں ہوتا۔"(۳۴)

لیکن اگر اسی مسئلے کو سماجی لسانیات کی رُو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زبان کے ساتھ رسم الخط کی وہی مناسبت ہے جو جسم کی ساتھ روح کی ہے۔

سماجی لسانیات میں ہونے والی تازہ ترین تحقیق نے ایک زبان کے لیے ایک سے زیادہ رسوم خط جیسے مباحث پر بھی توجہ دی ہے۔ زبان کی ایسی حالت کے لیے'Digraphia ' اور ' Biscriptality' کی اصطلاحات استعمال کی جارہی ہیں۔ Digraphia کی دو اقسام بیان کی گئی ہیں۔ Asynchronic یا 'یک زمانی' جس میں ایک ہی وقت میں ایک زبان کے لیے ایک سے زیادہ رسوم

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

خطوط استعمال ہوں مثلاً اردو، چینی، سربین وغیرہ اور Diasynchronic یا 'ذوزمانی' یعنی جب کسی زمانے میں، اس سے پچھلے زمانے میں موجود رسم الخط کو کسی نئے رسم الخط سے بدل دیا جائے۔ مثلاً ترکی کا رسم الخط عربی الاصل سے بدل کر لاطینی نژاد کر دیا گیا۔ رابرٹ ڈی۔ کنگ اردو اور ہندی کے رسم الخط کے مسئلے پر Digraphia کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "The script differences in "typical" cases of digraphia almost always mask profound differences both linguistic and societal: in grammar and vocabulary, in cultural orientation and often in religious orientation as well, in history, in style and preferences for deferent literary genres, in way of life and sensibility. Digraphia is not unlike the proverbial ten percent of an iceberg that is visible above the water: the part that is visible_the script_is the least of it." (35)

۲۰۱۱ء میں جرمنی میں رسومِ خط کے موضوع پر Biscriptality–sociolinguistic and cultural scenarios کے نام سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ذوخطی یا دوہری ترسیم (Biscriptality) کی تین بنیادی اقسام میں درجہ بندی کی گئی:-

Digraphia : زبان کے تفاعلات کے مطابق اعلیٰ یا ادنیٰ زبان کا الگ الگ رسم الخط

Scriptal Pluricenterity : جغرافیہ یا مذہب کی بنیاد پر ایک زبان کے لیے دو رسم الخط

Bigraphisim : ایک زبان کے لیے آزادانہ انتخاب کی سہولت کے ساتھ مساوی حیثیت میں رائج رسومِ خط

اس تقسیم میں اردو ہندی کو اپنے جغرافیائی اور اس سے بھی بڑھ کر سیاسی و مذہبی اسباب کی بنا پر دو رسم الخط اختیار کرنے کے باعث Scriptal Pluricenterity کی ذیل میں رکھا گیا۔(۳۶) زبان کے رسم الخط کے حوالے سے سامنے آنے والے ان نئے مباحث سے جہاں زبان کے اس اہم جزو کے مجموعی طور پر زبان اور اس کی تہذیب کے ساتھ جڑے نئے رشتے دریافت ہو سکیں گے وہاں ایک زبان کے لیے ایک سے زائد رسومِ خط اختیار کرنے کے حوالے سے بھی مثبت رجحانات سامنے آسکتے ہیں۔

اس بحث کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو اور ہندی کو ایک یا الگ الگ زبانیں قرار دینے کی بنیاد دراصل نظریہ پیش کرنے والے کا تناظر ہے۔ لسانیات یعنی توضیحی لسانیات کی رُو سے یہ ایک ہی زبان ہے جبکہ سماجی لسانیات اس کے تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں کو سامنے لا کر ان کے درمیان فرق کو واضح کرتی ہے۔ اس کے باوجود سماجی لسانیات کی رُو سے اسے الگ زبان کہنے کی بجائے دو لسانی گروہوں (Speech Communities) کی زبان کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اردو ہندی تنازع کے برِصغیر میں فروغ پانے کے اسباب میں مسلمانوں کا سیاسی زوال، ہندوؤں اور مسلمانوں میں احیا پرستی کی تحاریک اور ان دونوں کے پس منظر میں کارفرما نوآبادیاتی نظام کی پالیسیاں شامل تھیں۔ اردو زبان میں تاریخ کے ہر دور کی طرح آج بھی اپنے بولنے والوں کو تقسیم کرنے کی بجائے انھیں متحد کر کے مشترکہ تہذیبی، علمی اور ادبی ورثے کا امین بنانے کی صلاحیت اور طاقت موجود ہے۔ آج بھی ایسی کوششوں کی سمت بندی کا انحصار اس مسئلے سے جڑے لوگوں کے تناظر اور ترجیحات پر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ گیان چند جین، ڈاکٹر۔ ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء۔ ص ۲۶۳

۲۔ ایضاً۔ ص ۲۶۳

۳۔ ایضاً۔ ص ۲۷۱

۴۔ خلیل بیگ، مرزا احمد۔ ایک بھاشا… جو مسترد کر دی گئی۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء۔ ص ۶۱

۵۔ ایضاً۔ ص ۶۳

۶۔ ایضاً۔ ص ۶۲

۷۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر۔ لسانیاتی مباحث۔ کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۵ء۔ ص ۱۵

۸۔ خلیل بیگ، مرزا محمد۔ محوّلہ بالا، ص ۶۲

۹۔ گیان چند جین، ڈاکٹر۔ محوّلہ بالا، ص ۲۶۳

۱۰۔ فاروقی، شمس الرحمن۔ "ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب" مشمولہ، اردو زبان اور اردو رسم الخط (مرتبہ) پروفیسر فتح محمد ملک، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء۔ ص ۲۵

۱۱۔ گیان چند جین، ڈاکٹر۔ محوّلہ بالا، ص ۲۵

۱۲۔ ایضاً۔ ص ۲۶۳

13- Crystal, David. *A Dictionary of Linguistics and Phonetics (6th edition)*, UK: Blackwell publishing, 2008, P. 440, 441.

۱۴۔ خلیل بیگ، مرزا محمد۔ محوّلہ بالا، ص ۶۳، ۶۲

۱۵۔ ایضاً۔ ص ۶۳

۱۶۔ گیان چند جین، ڈاکٹر۔ محوّلہ بالا، ص ۲۷۹

۱۷۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر۔ محوّلہ بالا، ص ۱۵

Vol.5 No. 2 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

۱۸۔ خلیل بیگ، مرزا محمد۔ محوّلہ بالا، ص۴۷

۱۹۔ ایضاً۔ ص۳٦

۲۰۔ ایضاً۔ ص۳۹

۲۱۔ نیّر، ڈاکٹر ناصر عباس۔ ’مابعد نوآبادیات۔ اردو کے تناظر میں‘۔ کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء۔ ص۱۲۱

۲۲۔ فاروقی، شمس الرحمن۔ اردو کا ابتدائی زمانہ۔ کراچی: آج، ۲۰۰۹ء۔ ص۲۵

۲۳۔ نیّر، ڈاکٹر ناصر عباس۔ ’مابعد نوآبادیات۔ محوّلہ بالا، ص۲۷۹

۲۴۔ گیان چند جین، ڈاکٹر۔ محوّلہ بالا، ص۲۷۹

25. King, Christopher. R. *One Language Two Scripts: The Hindi Movement in Nineteenth Century North India*. New Delhi: Oxford University Press, 1994, p.103

۲٦۔ عزیز احمد۔ ’برِ صغیر میں اسلامی کلچر‘۔ (مترجم: جمیل جالبی)، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۴ء۔ ص۴۰۴

۲۷۔ سید عابد حسین، ڈاکٹر ۔ ”مشترکہ ہندوستانی تہذیب“مشمولہ اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی: اردو اکادمی ۲۰۱۴ء، ص ۱۱

28. Rehman, Tariq. *From Hindi to Urdu*. Karachi: Oxford University Press, 2013, p.109-110

29. Ibid. p.261-268

۳۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ ’ہندی اردو تنازع‘۔ اسلام آباد: قومی کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ پیدائش قائدِاعظم محمد علی جناحؒ، ۱۹۷۷ء، ص۹۸

31. King, Robert D. "The Poisonous Potency of Script: Hindi and Urdu". *International Journal of the Sociology of Languages* 150: p. 53

۳۲۔ خلیل بیگ، مرزا محمد۔ محوّلہ بالا، ص۷۹

۳۳۔ ایضاً۔ ص۱۱۰، ۱۰۹

۳۴۔ گیان چند جین، ڈاکٹر۔ محوّلہ بالا، ص۱

35. King, Robert D. "The Poisonous Potency of Script: Hindi and Urdu". *International Journal of the Sociology of Languages* 150: p. 44

36- www.biscriptaltiy.org

کتابیات

اُردو کتب:

- خلیل بیگ، مرزا۔ ’ایک بھاشا... جو مسترد کر دی گئی‘، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۷ء
- رؤف پاریکھ، ڈاکٹر۔ ’لسانیاتی مباحث‘ کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۵ء
- سید عابد حسین، ڈاکٹر۔ ”مشترکہ ہندوستانی تہذیب“ مشمولہ اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی: اردو اکادمی ۲۰۱۴ء، ص ۰۱-۲۴
- گیان چند جین، ڈاکٹر۔ ’ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب‘۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء
- عزیز احمد۔ ’برِ صغیر میں اسلامی کلچر‘۔ (مترجم: جمیل جالبی)، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۴ء (طبع چہارم)
- فاروقی، شمس الرحمن۔ ’اردو کا ابتدائی زمانہ‘۔ کراچی: آج، ۲۰۰۹ء (تیسرا ایڈیشن)
- فتح محمد، ملک۔ ’اردو زبان اور اردو رسم الخط‘۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء
- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر۔ ’ہندی اردو تنازع‘۔ اسلام آباد: قومی کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ پیدائش قائدِاعظم محمد علی جناحؒ، ۱۹۷۷ء
- نیّر، ڈاکٹر ناصر عباس۔ ’مابعد نوآبادیات۔ اردو کے تناظر میں‘۔ کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء

انگریزی کتب:

- Abid Muneer, Mian. *Radiant Lectures on Linguistics and Phonetics*. Lahore: Beacon Books, 2013.
- Crrystal, David. *A Dictionary of Linguistics and Phonetics*. UK: Blackweel Publishing, 2008.
- King, Christopher. R. *One Language Two Scripts: The Hindi Movement in Nineteenth Century North India*. New Delhi: Oxford University Press, 1994.
- King, Robert D. "The Poisonous Potency of Script: Hindi and Urdu". International Journal of the Sociology of Languages 150: 43-59
- Rehman, Tariq. *From Hindi to Urdu*. Karachi: Oxford University Press, 2013.

انٹرنیٹ : Internet

- www.biscriptality.org
- www.google.com
- www.wikipedia.org